تقریر

تقریر بابت مسیح موعودؑ
وقت 5-7منٹ

حضرت مسیح موعودؑ کی احباب جماعت کو نصائح

(ملفوظات جلد 3 ایڈیشن 1984ء)

(تقریر نمبر 1)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (البقرہ:201)

یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسا تم اپنے باپوں کو یاد کرتے جو بلکہ اس سے بھی زیادہ اور سخت درجہ کی محبت کے ساتھ یاد کرو۔

آواز آرہی ہے یہ فونو گراف سے
ڈھونڈو خدا کو دل سے نہ لاف و گزاف سے
جب تک عمل نہیں ہے دل پاک و صاف سے
کمتر نہیں یہ مشغلہ بت کے طواف سے

سامعین کرام! حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیان فرمودہ ملفوظات کی دس جلدوں میں ذاتی اصلاح اور احباب جماعت کی تعلیم و تربیت و اصلاحِ احوال کے متعلق بہت قیمتی نصائح ملتی ہیں۔ آج سے ملفوظات جلد سوم کے ایڈیشن 1984ء سے چند اہم اور قیمتی نصائح آپ احباب کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں۔ آج کی تقریر ملفوظات جلد سوم میں بیان نصائح کی پہلی تقریر ہے۔

مَیں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ خدا ہے

آپؑ فرماتے ہیں۔

"غرض اس قسم کی ناپاک زندگی جو حقیقت میں گناہ کی لعنت ہے وہ عام ہو رہی ہے اور وہ پاک زندگی جو گناہ سے بچ کر ملتی ہے۔ وہ ایک لعلِ تاباں ہے جو کسی کے پاس نہیں۔ ہاں! خدا تعالیٰ نے وہ لعل تاباں مجھے دیا ہے اور مجھے اس نے مامُور کیا ہے کہ مَیں دنیا کو اس لعل تاباں کے حصول کی راہ بتاؤں۔ اس راہ پر چل کر مَیں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص یقیناً یقیناً اس کو حاصل کر لے گا اور وہ ذریعہ اَور وہ راہ جس سے یہ ملتا ہے ایک ہی ہے۔ جس کو خدا کی سچی معرفت کہتے ہیں۔ در حقیقت یہ مسئلہ بڑا مشکل اور نازک مسئلہ ہے کیونکہ ایک مشکل امر پر موقوف ہے۔ فلاسفر جیسا کہ مَیں نے پہلے کہا ہے آسمان اور زمین کو دیکھ کر اور دوسرے مصنوعات کی ترتیب ابلغ و محکم پر نظر کر کے صرف اتنا بتاتا ہے کہ کوئی صانع ہونا چاہیے۔ مگر مَیں اس سے بلند تر مقام پر لے جاتا ہوں اور اپنے ذاتی تجربوں کی بناء پر کہتا ہوں کہ خدا ہے۔

اب اس میں صریح فرق ہے مگر یہ فرق تب ہی نظر آسکتا ہے۔ جب آنکھ صاف ہو ایسی صاف آنکھ کے عطا ہونے پر انسان بنی نَوع کے حقوق اور خدا کے حقوق میں تمیز کر کے انہیں محفوظ کر لیتا ہے اور یہ وہی آنکھ ہے جس کو خدا کے دیکھنے کی آنکھ کہتے ہیں۔ اس آنکھ کے ملنے پر وہ پاک زندگی شروع ہوتی ہے اور گناہوں سے بچنے کا یہ ذریعہ تو کسی حالت میں درست نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے کو سزا ملے اور ہمارے گناہ معاف ہو جائیں۔ زید کو پھانسی ملے اور بکر بچ جاوے۔ کیونکہ اس کے ابطال پر یہی دلیل کافی ہے کہ خارجی اُمور میں ہم اُس کی کوئی نظیر نہیں پاتے اور اس طریق سے بچ نہیں سکتے بلکہ دلیر ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کُتّا ہے یہ بھیڑیا نہیں ہے۔ اصل میں اگر یہ بھیڑیا ہو اور ہم اس کو کُتّا سمجھیں تو بھی ممکن ہی نہیں کہ اس سے ڈریں اور وہ خوف کریں جو ایک خونخوار بھیڑیئے سے کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمیں علم نہیں ہے کہ وہ بھیڑیا ہے۔ ہمارے علم میں وہ ایک کُتّا ہے۔ لیکن اگر یہ علم ہو کہ یہ بھیڑیا ہے تو اس سے دُور بھاگیں گے اور اس سے بچنے کے لئے اچھی خاصی تیاری کریں گے۔ لیکن اگر یہ

علم اور بھی وسیع ہو جاوے کہ یہ شیر ہے۔ تو بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گا اور اس سے بچنے کے لئے اور بھی بڑی تیاری کریں گے۔ غرض جمیع قویٰ پر ہیبت اور تاثیر کے علم سے ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ پس اب یہ کیسی صاف صداقت ہے جس کو ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ پھر گناہوں سے بچنے کے واسطے کیا راہ ہو سکتی ہے؟

مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں اور مَیں ایسی صداقت پر قائم کیا گیا ہوں اور یہی حق ہے کہ جب تک خدائے قہار کی معرفت تام نہ ہو اور اس کی قوتوں اور طاقتوں کی ایک شمشیر برہنہ نظر نہ آجاوے انسان بدی سے بچ نہیں سکتا۔

بدی ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اور دل بے اختیار ہو ہو کر قابُو سے نکل جاتا ہے۔ خواہ کوئی یہ کہے کہ شیطان حملہ کرتا ہے، خواہ کسی اور طرز پر اس کو بیان کیا جاوے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ آج کل بدی کا زور ہے اور شیطان اپنی حکومت اور سلطنت کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ بدکاری اور بے حیائی کے دریا کا بند ٹوٹ پڑا ہے اور وہ اطراف میں طُوفانی رنگ میں جوش زن ہے۔ پس کس قدر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر مصیبت اور مشکل کے وقت انسان کا دستگیر ہوتا ہے اس وقت اُسے ہر بلا سے نجات دے۔ چنانچہ اُس نے اپنے فضل سے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ دنیا نے اس سیلاب سے بچنے کے واسطے مختلف حیلے نکالے ہیں اور جیسا کہ مَیں نے ابھی کہا ہے عیسائیوں نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کے بیان کرنے سے بھی شرم آتی ہے پھر اس کا علاج وہی ہے جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے یعنی یہ کہ وہ مُفید اور نفع رساں چیزوں کی طرف رغبت کرتا ہے اور مضرّ اور نقصان رساں چیزوں سے دور بھاگتا ہے اور نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ دیکھو! سونے اور چاندی کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے تو اس کی طرف کیسی رغبت کرتا ہے اور کن کن محنتوں اور مشکلات سے اُسے بہم پہنچاتا ہے اور پھر کن حفاظتوں سے اُسے رکھتا ہے لیکن اگر کوئی شخص سونے چاندی کو تو پھینک دے اور اس کے بجائے مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اُٹھا کر اپنے صندوقوں میں بند کر کے ان کی حفاظت کرنے لگے تو کیا ڈاکٹر اس کی دیوانگی کا فتویٰ نہ دیں گے۔ ضرور دیں گے۔ اسی طرح پر جب ہمیں یہ محسوس ہو جاوے کہ خدا ہے اور وہ بدی سے نفرت کرتا اور نیکی کو پیار کرتا ہے اور نیکیوں کو عزیز رکھتا ہے تو ہم دیوانہ وار نیکیوں کی طرف دوڑیں گے اور گناہ کی زندگی سے دُور بھاگیں گے۔ یہی ایک اصول ہے جو نیکی کی قوت کو طاقت بخشتا اور نیکی کے قویٰ کو تحریک دیتا ہے اور بدی کی قوتوں کو ہلاک کرتا اور شیطان کی ذریّت کو شکست دیتا ہے۔

جب واقعی طور پر اس آفتاب کی طرح جو اس وقت دنیا پر چمکتا ہے خدا پر ہمیں یقین حاصِل ہو جاوے اور ہم خدا کو گویا دیکھ لیں تو یقیناً ہماری سِفلی زندگی پر موت وارد ہو جاتی ہے اور اس کے بجائے ایک آسمانی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام اور دوسرے راستبازوں کی زندگیاں تھیں۔

مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خدا کی رحمت فرماں برداروں اور راستبازوں پر ہوتی ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے حضور نیکی اور پاکیزگی کا تُحفہ لے کر جاتے ہیں اور شرارتوں اور بدکاریوں سے اس لئے دُور رہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ سے بُعد اور حرمان کا موجب ہیں ایسے لوگ ایک پاک چشمہ سے دھوئے جاتے ہیں جس کا دھویا ہوا پھر کبھی مَیلا اور ناپاک نہیں ہوتا اور انہیں وہ شربت پلایا جاتا ہے جس کے پینے والا کبھی پیاسا نہیں ہو سکتا۔ انہیں وہ زندگی عطا ہوتی ہے جس پر کبھی مَوت وارد نہیں ہوتی۔ انہیں وہ جنّت دیا جاتا ہے جس سے کبھی نکلنا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے وہ لوگ جو اس چشمہ سے سیراب نہیں ہوتے اور خدا کے ہاتھوں سے جس کا مسح نہیں ہوتا وہ خدا سے دُور جاتے ہیں اور شیطان کے قریب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے خدا کی طرف آنا چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نہ ان میں تسلّی کی کوئی راہ باقی ہے۔ نہ ان کے پاس دلائل ہیں اور نہ تاثیرات۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 16-19)

سامعین!

حقوق اللہ کو دیانت داری سے ادا کرو

آپؑ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے بڑا حق یہی ہے کہ اُس کی عبادت کی جاوے اور یہ عبادت کسی غرض ذاتی پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ اگر دوزخ اور بہشت نہ بھی ہوں۔ تب بھی اس کی عبادت کی جاوے اور اس ذاتی محبت میں جو مخلوق کو اپنے خالق سے ہونی چاہئے کوئی فرق نہ آوے۔ اس لئے ان حقوق میں دوزخ اور بہشت کا سوال نہیں ہونا چاہیے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی میں میرا یہ مذہب ہے کہ جبتک دشمن کے لئے دعا نہ کی جاوے پورے طور پر سینہ صاف نہیں ہوتا ہے۔ اُدْعُونِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی کہ دشمن کے لئے دعا کرو تو قبول نہیں کروں گا۔ بلکہ میرا تو یہ مذہب ہے کہ دشمن کے لئے دعا کرنا یہ بھی سنتِ نبوی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی سے مسلمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے لئے اکثر دعا کیا کرتے تھے۔ اس لئے بُخل کے ساتھ ذاتی دُشمنی نہیں کرنی چاہئے اور

حقیقۃً مُوذی نہیں ہونا چاہئے۔ شکر کی بات ہے کہ ہمیں اپنا کوئی دشمن نظر نہیں آتا جس کے واسطے دو تین مرتبہ دعا نہ کی ہو۔ ایک بھی ایسا نہیں اور یہی مَیں تمہیں کہتا ہوں اور سکھاتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اس سے کہ کسی کو حقیقی طور پر ایذا پہنچائی جاوے اور ناحق بُخل کی راہ سے دشمنی کی جاوے، ایسا ہی بیزار ہے جیسے وہ نہیں چاہتا۔ کہ کوئی اس کے ساتھ ملایا جاوے۔ ایک جگہ وہ فصل نہیں چاہتا اور ایک جگہ وصل نہیں چاہتا یعنی بنی نوع کا باہمی فصل اور اپنا کسی غیر کے ساتھ وصل۔ اور یہ وہی راہ ہے کہ منکروں کی واسطے بھی دعا کی جاوے۔ اس سے سینہ صاف اور انشراح پیدا ہوتا ہے اور ہمت بلند ہوتی ہے۔ اس لئے جبتک ہماری جماعت یہ رنگ اختیار نہیں کرتی۔ اس میں اور اُس کے غیر میں پھر کوئی امتیاز نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ ضروری امر ہے کہ جو شخص ایک کے ساتھ دین کی راہ سے دوستی کرتا ہے اور اس کے عزیزوں سے کوئی ادنیٰ درجہ کا ہے تو اس کے ساتھ نہایت رفق اور ملائمت سے پیش آنا چاہئے اور ان سے محبت کرنی چاہئے کیونکہ خدا کی یہ شان ہے۔ بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

پس تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو تمہیں چاہئے کہ تم ایسی قوم بنو جس کی نسبت آیا ہے فَاِنَّھُم قَوْمٌ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ یعنی وہ ایسی قوم ہے کہ ان کا ہم جلیس بدبخت نہیں ہوتا۔ یہ خلاصہ ہے ایسی تعلیم کا جو تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ میں پیش کی گئی ہے۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 16-19)

محبت الٰہی اور اپنی جماعت کو نصائح

آپؑ فرماتے ہیں:

"خدا کے ساتھ محبت کرنے سے کیا مُراد ہے؟ یہی کہ اپنے والدین، جورو، اپنی اَولاد، اپنے نفس، غرض ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی رضاء کو مقدم کر لیا جاوے چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ آبَاءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا (البقرہ:201) یعنی اللہ تعالی کو ایسا یاد کرو کہ جیسا تم اپنے باپوں کو یاد کرتے جو بلکہ اس سے بھی زیادہ اور سخت درجہ کی محبت کے ساتھ یاد کرو۔ اب یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ خدا تعالے نے یہ تعلیم نہیں دی کہ تم خدا کو باپ کہا کرو بلکہ اس لئے یہ سکھایا ہے کہ نصاریٰ کی طرح دھوکہ نہ لگے اور خدا کو باپ کرکے پکارا نہ جائے اور اگر کوئی ہے کہ پھر باپ سے کم درجہ کی محبت ہوئی تو اس اعتراض کے رفع کرنے کیلئے اداشدہ ذکر ارکھ دیا، اگر اواشدّ ذکر انہ ہوتا تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا مگر اب اس نے اُس کو حل کر دیا جو باپ کہتے ہیں وہ کیسے گرے کہ ایک عاجز کو خدا کہہ اُٹھے۔

بعض الفاظ ابتلا کے لئے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی کو نصاریٰ کا ابتلا منظور تھا۔ اس لئے اُن کی کتابوں میں انبیاء کی یہ اصطلاح ٹھہر گئی۔ مگر چونکہ وہ حکیم اور علیم ہے اس لئے پہلے ہی سے لفظ اَبْ کو کثیر الاستعمال کر دیا۔ مگر نصاریٰ کی بدقسمتی کہ جب مسیح نے یہ لفظ بولا تو انہوں نے حقیقت پر حمل کر لیا اور دھوکا کھالیا۔ حالانکہ مسیح نے یہ کہہ کر کہ تمہاری کتابوں میں لکھا ہے کہ تم اِلٰہ ہو اس شرک کو مٹانا چاہا اور اُن کو سمجھانا چاہا مگر نادانوں نے پرواہ نہ کی اور اُن کی اس تعلیم کے ہوتے ہوئے بھی اُن کو ابن اللہ قرار دے ہی لیا۔

یہودیوں کو بھی اس قسم کا ابتلا آیا۔ چونکہ موذی قوم تھی۔ اُن کی درخواست پر منّ وسلویٰ نازل ہوا کیونکہ یہ طاعون پیدا کرنے کا مقدمہ تھا۔ اللہ تعالے چونکہ جانتا تھا کہ وہ حد سے نکل جائیں گے اور اُن کی سزا طاعون تھی۔ اس لئے پہلے سے وہ اسباب رکھ دیئے۔

مَیں پھر اصل مطلب کی طرف آتا ہوں کہ اصل توحید کو قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت سے پورا حصہ لو اور یہ محبت ثابت نہیں ہو سکتی جبتک عملی حصہ میں کامل نہ ہو۔ نری زبان سے ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مصری کا نام لیتا ہے تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ شیریں کام ہو جاوے یا اگر زبان سے کسی کی دوستی کا اعتراف اور اقرار کرے مگر مصیبت اور وقت پڑنے پر اس کی امداد اور دستگیری سے پہلو تہی کرے تو وہ دوست صادق نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی طرح پر اگر خدا تعالیٰ کی توحید کا نِرا زبانی ہی اقرار ہو اور اس کے ساتھ محبت کا بھی زبانی ہی اقرار موجود ہو تو کچھ فائدہ نہیں بلکہ یہ حصّہ زبانی اقرار کی بجائے عملی حصّہ کو زیادہ چاہتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ زبانی اقرار کوئی چیز نہیں ہے۔ نہیں! میری غرض یہ ہے کہ زبانی اقرار کے ساتھ عملی تصدیق لازمی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ خدا کی راہ میں اپنی زندگی وقف کرو اور یہی اسلام ہے۔ یہی وہ غرض ہے جس کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ پس جو اس وقت اس چشمہ کے نزدیک نہیں آتا جو خدا تعالیٰ نے اس غرض کیلئے جاری کیا ہے وہ یقیناً بے نصیب رہتا ہے اگر کچھ لینا ہے اور مقصد کو حاصل کرنا ہے تو طالب صادق کو چاہیے کہ وہ چشمہ کیطرف بڑھے اور آگے قدم رکھے اور اس چشمہ جاری کے کنارے اپنا منہ رکھ دے اور یہ ہو نہیں سکتا جبتک خدا تعالی کے سامنے غیرت کا چولہ اتار کر آستانہ ربوبیت پر نہ گر جائے اور یہ عہد نہ کرے کہ خواہ دنیا کی وجاہت جاتی رہے اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو بھی خدا کو نہیں چھوڑے گا اور خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کا یہی عظیم الشان

اخلاص تھا کہ بیٹے کی قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ بہت سے ابراہیم بنائے پس تم میں سے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہئے کہ ابراہیم بنو۔ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ

ولی پرست نہ بنو۔ بلکہ ولی بنو اور پیر پرست نہ بنو۔ بلکہ پیر بنو

تم ان راہوں سے آؤ بیشک وہ تنگ راہیں ہیں۔ لیکن اُن سے داخل ہو کر راحت اور آرام ملتا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ اس دروازہ سے بالکل ہلکے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اگر بہت بڑی گٹھڑی سر پر ہو تو مشکل ہے۔ اگر گزرنا چاہتے ہو تو اس گٹھڑی کو جو دنیا کے تعلقات اور دنیا کو دین پر مقدم کرنے کی گٹھڑی ہے، پھینک دو۔ ہماری جماعت خدا کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کو پھینک دے۔ تم یقیناً یاد رکھو کہ اگر تم میں وفاداری اور اخلاص نہ ہو تو تم جھوٹے ٹھہروگے اور خدا تعالیٰ کے حضور راستباز نہیں بن سکتے۔ ایسی صورت میں دشمن سے پہلے وہ ہلاک ہو گا۔ جو وفاداری کو چھوڑ کر غداری کی راہ اختیار کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ فریب نہیں کھا سکتا اور نہ کوئی اُسے فریب دے سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تم سچا اخلاص اور صدق پیدا کرو۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 188-190)

سامعین!

سنت اللہ تبدیل نہیں ہوا کرتی

حضورؑ فرماتے ہیں:

"مذہب ایک ایسی چیز ہے کہ مختلف مذہب کے لوگ یک جا جمع نہیں ہو سکتے۔ سُنّۃُ اللّٰہ کا نہ سمجھنا بھی ایک زہر ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ بعض وقت بلا کو ہم ٹلا دیتے ہیں۔ تو انسان بے باک ہو کر کہتا ہے کہ بلا ٹل گئی اور پھر شوخیاں کرنے لگتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ پکڑتا ہے اور ہلاک کر دیتا ہے۔ پس اگر طاعون کم ہو جاوے تو اس سے دلیر نہیں ہونا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کی مہلت سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

مسیح موعود کے وقت میں وبا کا پھیلنا عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک تو مسلّم ہی ہے۔ ہندو بھی مانتے ہیں کہ آخری دنوں میں ایک وبا ہو گی اور اس وقت آنیوالے کا نام رودّر گوپال ہو گا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام فرقوں میں جیسے آخری دنوں میں ایک موعود کے آنے کا عقیدہ مشترک ہے ویسے ہی یہ بھی مانا گیا ہے کہ اس وقت وبا پڑے گی۔ پس دعاؤں سے کام لینا چاہیے اور خدا تعالیٰ کے حضور استغفار کرنا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ غنی بے نیاز ہے۔ اس پر کسی کی حکومت نہیں ہے۔ ایک شخص اگر عاجزی اور فروتنی سے اس کے حضور نہیں آتا وہ اس کی کیا پرواہ کر سکتا ہے۔ دیکھو! اگر ایک سائل کسی کے پاس آجاوے اور اپنا عجز اور غربت ظاہر کرے تو ضرور ہے کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک ہو لیکن ایک شخص جو گھوڑی پر سوار ہو کر آوے اور سوال کرے اور یہ بھی کہے کہ اگر نہ دوگے تو ڈنڈے ماروں گا۔ تو بجز اس کے کہ خود اس کو ڈنڈے پڑیں اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ خدا تعالیٰ سے اَڑ کر مانگنا اور اپنے ایمان کو مشروط کرنا بڑی بھاری غلطی اور ٹھوکر کا موجب ہے۔ دعاؤں میں استقلال اور صبر ایک الگ چیز ہے اور اَڑ کر مانگنا اور بات ہے۔ یہ کہنا کہ میرا فلاں کام اگر نہ ہوا تو مَیں انکار کر دوں گا۔ یا یہ کہہ دوں گا یہ بڑی نادانی اور شرک ہے اور آداب الدُّعا سے ناواقفیت ہے۔ ایسے لوگ دعا کی فلاسفی سے ناواقف ہیں۔ قرآن شریف میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ہر ایک دعا تمہاری مرضی کے موافق مَیں قبول کروں گا۔ بیشک یہ ہم مانتے ہیں کہ قرآن شریف میں لکھا ہوا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ لیکن ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ اسی قرآن شریف میں یہ بھی لکھا ہوا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں اگر تمہاری مانتا ہے تو لَنَبْلُوَنَّکُم میں اپنی منوانی چاہتا ہے یہ خدا تعالیٰ کا احسان اور اس کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندہ کی بھی مان لیتا ہے۔ ورنہ اس کی اُلوہیت اور ربوبیت کی شان کے یہ ہرگز خلاف نہیں کہ اپنی ہی منوائے۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُم بِشَیْءٍ مِنَ الْخَوْفِ جو فرمایا۔ تو اس مقام پر وہ اپنی منوانا چاہتا ہے کبھی کسی قسم کا خوف آتا ہے اور کبھی بھوک آتی ہے اور کبھی مالوں پر کمی واقع ہوتی ہے۔ تجارتوں میں خسارہ ہوتا ہے اور کبھی ثمرات میں کمی ہوتی ہے۔ اولاد ضائع ہوتی ہے اور ثمرات برباد ہو جاتے ہیں اور نتائج نقصان دہ ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں خدا تعالیٰ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اُس وقت خدا اپنی شان حکومت دکھانا چاہتا ہے اور اپنی منوانا چاہتا ہے۔ اس وقت صادق اور مومن کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نہایت اخلاص اور انشراح صدر کے ساتھ خدا کی رضا کو مقدم کر لیتا ہے اور اس پر خوش ہو جاتا ہے۔ کوئی شکوہ اور بدظنّی نہیں کرتا۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ۔ پس صبر کرنے والوں کو بشارت دو۔ یہ نہیں فرمایا کہ دعا کرنے والوں کو بشارت دو بلکہ صبر کرنے والوں کو۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اگر بظاہر اپنی دعاؤں میں ناکامی

دیکھے تو گھر نہ جاوے بلکہ صبر اور استقلال سے خدا تعالیٰ کی رضا کو مقدم کرے۔ اہل اللہ کو نظر آجاتا ہے کہ یہ کام ہونہار ہے۔ پس جب وہ یہ دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں۔ ورنہ قضاو قدر پر راضی رہتے ہیں۔ اہل اللہ کے دو ہی کام ہوتے ہیں۔ جب کسی بلا کے آثار دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ قضاو قدر اس طرح پر ہے تو صبر کرتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچوں کی وفات پر صبر کیا جن میں سے ایک بچہ ابراہیم بھی تھا۔

جبکہ خدا تعالےٰ نے یہ دو تقسیمیں رکھ دی ہیں اور یہ اس کی سنت ٹھہر چکی ہے اور یہ بھی اس نے فرمایا ہے۔ لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبدِيلاً پھر کس قدر غلطی ہے جو انسان اس کے خلاف چاہے۔ مَیں نے بارہا بتایا ہے کہ انسان کے ساتھ خدا نے دوستانہ معاملہ رکھا ہے کبھی ایک دوست دوسرے کی مان لیتا ہے اور کبھی اپنی منواتا ہے اور دعا بندہ اور خدا میں بھاجی کی طرح ہیں۔ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ خدا تعالیٰ کمزور رعایا کی طرح ہر بات مان لے۔ تو یہ نقص ہے۔ ماں بھی بچہ کی ہر بات نہیں مان سکتی کبھی بچہ آگ کی انگاریاں مانگتا ہے۔ تو وہ کب دیتی ہے۔ یا مثلاً آنکھیں دُکھتی ہوں تو اُسے زِنک یا اور کوئی دوا ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ اسی طرح پر بندہ چونکہ تکمیل کا محتاج ہے۔ اُسے ماروں کی ضرورت ہے۔ تا کہ وہ صدق و وفا اور ثبات قدم میں کامل ثابت ہو۔

پھر دعا کرانے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صابر ہو۔ جلد باز نہ ہو۔ جو ذرا سی بات پر دجّال کہنے کو تیار ہے پس وہ کیا فائدہ اُٹھائے گا۔ اسے تو چاہیے کہ صبر کے ساتھ انتظار کرے اور حسن ظن سے کام لے۔ جب خدا تعالیٰ نے لَنَبْلُوَنَّكُم فرمایا ہے۔ تو صبر کرنے والوں کے لئے بشارت دی اور أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ بھی فرمایا۔ میرے نزدیک اس کے یہی معنی ہیں کہ قبولیتِ دعا کی ایک راہ نکال دیتا ہے۔ حکام کا بھی یہی حال ہے کہ جس پر ناراض ہوتے ہیں اگر وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتا اور شکوہ اور بدظنی نہیں کرتا تو اسے ترقی دے دیتے ہیں۔ قرآن شریف سے صاف پایا جاتا ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ابتلا آویں جیسے فرمایا۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔یعنی کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف اٰمنّا کہنے سے چھوڑے جائیں اور وہ فتنوں میں نہ پڑیں۔ انبیاء علیہم السلام کو دیکھو۔ آوائل میں کس قدر دکھ ملتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف دیکھو کہ آپ کو مکّی زندگی میں کیس قدر دکھ اُٹھانے پڑے۔ طائف میں جب آپؐ گئے تو اس قدر آپؐ کے پتھر مارے کہ خون جاری ہو گیا۔ تب آپؐ نے فرمایا کہ کیسا وقت ہے مَیں کلام کرتا ہوں اور لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور پھر کہا کہ اے میرے رب! مَیں اس دکھ پر صبر کروں گا۔ جبتک کہ تو راضی ہو جاوے۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 384-387)

سامعین! شفیع کون ہو سکتا ہے؟

فرمایا:

"شفیع کا لفظ شفع سے نکلا ہے جس کے معنے جفت کے ہیں۔ اس لئے شفیع وہ ہو سکتا ہے جو دو مقامات کا مظہر اتم ہو یعنی مظہر کامل لاہوت اور ناسوت کا ہو۔ لاہوتی مقام کا مظہر کامل ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا خدا کی طرف صعود ہو۔ وہ خدا سے حاصل کرے اور ناسوتی مقام کے مظہر کا یہ مفہوم ہے کہ مخلوق کی طرف اس کا نزول ہو جو خدا سے حاصل کرے وہ مخلوق کو پہنچا دے اور مظہر کامل ان مقامات کا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْاَدْنٰى (النجم:9-10)

ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدُوں کامل حصہ مقام لاہوت کا کسی نبی میں نہیں آیا اور ناسوتی حصہ چاہتا ہے بشری لوازم کو ساتھ رکھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں یہ ساری باتیں پوری پائی جاتی ہیں۔ آپؐ نے شادیاں بھی کیں۔ بچے بھی ہوئے۔ دوستوں کا زمرہ بھی تھا۔ فتوحات کر کے اختیاری قوتوں کے ہوتے ہوئے انتقام چھوڑ کر رحم کر کے بھی دکھایا۔ جبتک انسان کے پیرایہ پورے نہ ہوں وہ پوری ہمدردی نہیں کر سکتا۔ اس حصّہ اخلاقِ فاضلہ میں وہ نامکمل رہے گا مثلاً جس نے شادی ہی نہیں کی وہ بیوی اور بچوں کے حقوق کی کیا قدر کر سکتا ہے اور اُن پر اپنی شفقت اور ہمدردی کا کیا نمونہ دکھا سکتا ہے۔ رہبانیت، ہمدردی کو دور کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت کو نہیں رکھا۔ غرض کامل شفیع وہی ہو سکتا ہے جس میں یہ دونوں حصے کامل طور پر پائے جائیں۔ چونکہ یہ ایک ضروری امر تھا کہ شفیع ان دونوں مقامات کا مظہر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے ہی اس سلسلہ کا ظلّ قائم رکھا یعنی آدم علیہ السلام کو جب پیدا کیا تو لاہوتی حصّہ تو اس میں یوں رکھ دیا جب کہا۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ اور ناسوتی حصہ یوں رکھا کہ حوّا کو اس سے پیدا کیا۔

یعنی جب روح پھونکی تو ایک جوڑا آدم کا خدا تعالیٰ سے قائم ہوا اور جب حوّا نکالی تو دوسرا جوڑ مخلوق کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ناسوتی ہو گیا۔ پس جبتک یہ دونوں حِصے کامل طور پر کامل انسان میں نہ پائے جائیں وہ شفیع نہیں ہو سکتا۔ جیسے آدم کی پسلی سے حوّا نکلی تو اسی طرح پر کامل انسان سے مخلوق نکلتی ہے۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 230-231)

(کمپوزڈ: مسز بقعۃ النور عمران۔ جرمنی)

✿✿✿✿